مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

مقالات

نظریۂ ارتقاء

کسی چیز کے بتدریج آگے بڑھنے کا نام ارتقاء ہے۔ انسان کا بچہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ اس کا جسمانی ارتقاء ہے۔ پھر وہ تعلیم کی طرف آتا ہے، پہلی جماعت میں بیٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ یہ اس کا علمی ارتقاء ہے۔ کسی انسانی ذہن نے پہیہ کی ساخت اور اس کے فوائد پر غور کیا پھر اسے عملی شکل دی، تو آج انسان نے محیر العقول مشینیں ایجاد کر لی ہیں، یہ انسان کا ذہنی ارتقاء ہے۔

ارتقاء کا یہ قانون صرف انسان میں نہیں بلکہ تمام موجودات میں پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان دو دنوں (PERIODS) میں بنائے، اس کے بعد چار دنوں میں زمین اور اس میں بالیدگی کی قوتوں کو بنایا۔ اس سے ارتقاء کا قانون واضح طور پر ثابت ہے۔

پھر یہ بات بھی ہمارے مشاہدہ میں آچکی ہے کہ ان قدرتی قوانین میں کچھ نہ کچھ مستثنیات بھی آجاتے ہیں۔ مثلاً تمام مائعات کی یہ خاصیت ہے کہ وہ جم کر یا ٹھوس شکل اختیار کر کے سکڑ جاتے ہیں اور یا ان کا حجم کم ہو جاتا ہے لیکن پانی جم کر پھیل جاتا ہے، یہ اس تمام قانون سے مستثنیٰ ہوا۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بالکل صحیح عقل و حواس اور ذہن رکھنے والے میاں بیوی کے ہاں بلید الذہن بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ارتقاء کے عام قانونِ قدرت سے مستثنیٰ ہوا۔ اسی طرح سنکھیا کی یہ خاصیت ہے کہ انسان کو ہلاک کر دیتا ہے، مگر کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کے لیے تریاق بن جاتا ہے یہ استثنائی صورت ہوئی۔ ان سب مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عام قوانینِ فطرت میں شاذ و نادر ہی سہی، تاہم مستثنیات کا وجود بھی ممکن ہے۔

کیا انسان اولادِ ارتقاء ہے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان بھی اس ارتقائی

قانونِ فطرت کے تحت حیوانیت سے انسانیت کی منزل میں پہنچا ہے یا اس کی تخلیق مستثنیات کے تحت بحیثیتِ انسان ہی ہوتی ہے۔ اس سوال کے جواب میں کئی نظریات معرضِ وجود میں آچکے ہیں، مثلاً:

۱۔ ایک طبقہ تو مذہبی لوگوں کا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہ حیثیت انسان ہی پیدا کیا ہے۔ اس تصور کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا۔ پھر اس سے اس کی بیوی پیدا کی، پھر اس جوڑے سے بنی نوعِ انسان تمام دنیا میں پھیلی۔ عام ارتقائی قانون سے انسان کو مستثنیٰ قرار دینے کے لیے ان کے ہاں دلیل یہ ہے کہ انسان کائنات کا ایک حصہ ہونے کے باوجود دوسرے تمام حیوانات اور دیگر اشیاء سے کئی باتوں میں الگ ہے مثلاً اس میں قوتِ اختیار و ارادہ ہے۔ عقل و شعور ہے۔ پھر بادی النظر میں قرآن کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو بنا کر اس میں اپنی رُوح پھونکی جو دوسری کسی چیز میں نہیں پھونکی گئی۔ اور اسی سے اسے عقل و شعور اور اختیار و ارادہ عطا کیا گیا۔ یہ چیز اسے عام ارتقائی قانون سے مستثنیٰ کر دیتی ہے۔ اس نظریہ کی حمایت بعض مغربی مفکرین نے بھی کی ہے۔

۲۔ دوسرا گروہ مادیین کا ہے جو اسے خالص ارتقائی شکل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، کیوں کہ کائنات میں بالعموم یہی قانون جاری و ساری ہے۔ اس کے نظریہ کے مطابق زندگی اربوں سال پہلے ساحلِ سمندر سے نمودار ہوئی۔ پھر اس سے نباتات اور اس کی مختلف انواع ظہور پذیر ہوئیں پھر حیوانات پیدا ہوئے۔ انہی حیوانات سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبۂ انسانیت تک پہنچا ہے۔ اس تدریجی سفر کے طویل سفر میں کوئی نقطہ نظر ایسا نہیں ہو سکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کا وجود ختم کر کے نوعِ انسانی کا آغاز تسلیم کیا جائے۔

بعض مسلمان مفکرین مثلاً ابن خلدون، ابن مسکویہ اور حافظ مسعودی نے بھی اشیائے کائنات میں مشابہت دیکھ کر اس نظریۂ ارتقاء کی کسی حد تک تائید کی ہے، اس سے بھی آگے چلیے تو تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ ق م) نے یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ (زریں معلومات از عطش درانی ص ۷) اور انسائیکلو پیڈیا اردو (مطبوعہ فیروز سنز، زیرِ عنوان ارتقائیت) کے مطابق قدیم زمانہ میں تھیلیس، عناکسی مینڈر، عناکسی مینس، ایمپی دوکل اور جوہر پسند فلاسفہ ارتقاء کے قائل تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں سر چارلس ڈارون (۱۸۰۸ - ۱۸۸۲ء) نے اصل الانواع (Origin of spicies) لکھ کر اس نظریہ کو باضابطہ طور پر پیش کیا۔

پھر اس نظریۂ ارتقاء کو تسلیم کرنے والوں میں بھی کافی اختلافات ہوئے ڈارون نے بندر اور انسان کو ایک ہی نوع قرار دیا کیونکہ حس وادراک کے پہلو سے ان دونوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے، گویا ڈارون کے نظریہ کے مطابق انسان بندر کا چچیرا بھائی ہے لیکن کچھ انتہا پسندوں نے انسان کو بندر ہی کی اولاد قرار دیا ہے۔ کچھ ان سے بھی آگے بڑھے تو کہا کہ تمام سفید فام انسان تو چمپینزی (chimpenzy) سے پیدا ہوئے ہیں، سیاہ فام انسان کا باپ گوریلا ہے اور لمبے ہاتھوں اور سرخ بالوں والے انسان تنگان بندر کی اولاد ہیں[1]

پھر کچھ مفکرین کا یہ خیال بھی ہے کہ انسان بندر کی اولاد نہیں بلکہ بندر انسان کی اولاد ہے (انسان اور نظریۂ ارتقاء ص ۱۱۸) اور اس رجعت قہقری کی مثالیں بھی کائنات میں پائی جاتی ہیں۔ قرآن سے بھی اس نظریہ کی کسی حد تک تائید ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ" (البقرۃ: ۶۵) "ہم نے ان بدکردار بنی اسرائیل) سے کہا کہ ذلیل بندر بن جاؤ"

اس آیت کی تفسیر میں راجح قول یہی ہے کہ ان کے ذہن تو وہی پہلے ہی رہے تھے، مگر جسمانی حالت بدل دی گئی اور وہ بندر بن گئے۔

۳۔ تخلیق کائنات بشمولیت انسان کا ایک تیسرا نظریہ نظریۂ آفت گیری (catastrophism) ہے جس کے بانی کوئیر ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق تمام اقسام کے تانبے علیحدہ علیحدہ طور پر تخلیق ہوئے، یہ ارضی وسماوی آفات میں مبتلا ہو کر نیست ونابود ہو گئے۔ پھر کچھ اور حیوانات تخلیق ہوئے، یہ بھی کچھ عرصہ بعد نیست ونابود ہو گئے۔ اسی طرح مختلف ادوار میں نئے حیوانات پیدا ہوئے اور فنا ہوتے رہے ہیں۔ (اسلام اور نظریۂ ارتقاء ص ۸۵) اس نظریہ کی بھی تائید قرآن کریم کی بعض آیتوں سے ہو جاتی ہے۔

چونکہ ڈارون کے نظریہ نے مذہبی دنیا میں ایک طرح کا اضطراب پیدا کر دیا ہے، لہٰذا ہم اس کا ذرا تفصیل سے جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ پہلے اس نظریہ کو ذرا تفصیل سے پیش کریں گے پھر اسے زیر بحث لایا جائے گا۔

---

[1] مورخین نے تو ان مختلف اللون انسانوں کو نوح کے بیٹوں حام، سام، یافث کی اولاد بتلایا ہے مگر یاد رہے انہیں چمپینزی گوریلا اور تنگان کی اولاد قرار دیتے ہیں۔

نظریۂ ارتقاء کیا ہے؟

زندگی کی ابتداء ساحل سمندر پر پایاب پانیوں سے ہوئی۔ پانی کی سطح پر کائی نمودار ہوئی پھر اس کائی کے نیچے سے حرکت پیدا ہوئی۔ یہ زندگی کی ابتداء تھی۔ پھر اس سے نباتات کی مختلف شکلیں بنتی گئیں۔ جرثومۂ حیات ترقی کر کے حیوانچہ بن گیا۔ پھر یہ حیوان بنا، یہ حیوان ترقی کرتے کرتے پردار اور بازوؤں والے حیوانات میں تبدیل ہوا۔ پھر اس نے فقری جانور کی شکل اختیار کی پھر انسان کے مشابہ حیوان بنا اور اس کے بعد انسان اول بنا جس میں عقل و فہم اور تکلم کی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ بالآخر وہ صاحب فہم و ذکاء انسان بن گیا۔ ان تمام تبدلات، تغیرات اور ارتقائے زندگی میں کتنی مدت صرف ہوئی، اس کا اندازہ کچھ اس طرح بتلایا جاتا ہے۔

آج سے دو ارب سال پیشتر سمندر کے کنارے پایاب پانی میں کائی کی نمود شروع ہوئی، یہ زندگی کا آغاز تھا۔ ۶۰ کروڑ سال قبل یک خلوی جانور پیدا ہوئے۔ مزید ۳ کروڑ سال بعد اسفنج اور دیگر سہ خلوی جانور پیدا ہوئے۔ ۴۵ کروڑ سال قبل پتوں کے بغیر پودے ظاہر ہوئے اور اسی دور میں ریڑھ کی ہڈی والے جانور پیدا ہوئے۔ ۴۰ کروڑ سال قبل مچھلیوں اور مکھیوں کی نمود ہوئی ۳۰ کروڑ سال قبل بڑے بڑے دلدلی جانور پیدا ہوئے۔ یہ عظیم الجثہ جانور ۸۴ فٹ تک لمبے اور ۳۵ ٹن تک وزنی تھے۔ ۱۳ کروڑ سال بعد یا آج سے ۱۷ کروڑ سال پہلے ان عظیم الجثہ جانوروں کا خاتمہ ہو گیا۔ ۴ کروڑ سال قبل ہاتھیوں، گھوڑوں اور بندروں کی نمود ہوئی ۲½ کروڑ سال قبل بے دم بوزنے (APE) نمودار ہوئے اور ڈیڑھ کروڑ سال بعد یعنی آج سے ایک کروڑ سال پہلے بے دم بوزنا سیدھا ہو کر چلنے لگا۔ (یہی وہ بندر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کا جدِ اعلیٰ ہے) اس سے ۳۰ لاکھ سال بعد یا آج سے ستر لاکھ سال پہلے اس بے دم بوزنے کی ایک قسم تھیکن تھروپس سے پہلی انسانی نسل پیدا ہوئی۔ مزید ۵۰ لاکھ سال یا آج سے ۲۰ لاکھ سال پہلے، پہلی باشعور انسانی نسل پیدا ہوئی جس نے پتھر کا ہتھیار اٹھایا۔ مزید ۲ لاکھ سال بعد اس میں ذہنی ارتقاء ہوا اور انسانی نسل نے غاروں میں رہنا شروع کیا۔ (زرین معلومات از عطش درانی ص ۷ تا ۹)

ڈارون نے سب سے پہلے کتاب اصل الانواع ۱۸۵۹ء میں لکھی، پھر اس کے بعد اصل الانسان (ORIGIN OF MAN) اور تسلسل انسانی (DESCENT OF MAN) لکھ کر اپنے نظریہ کی تائید مزید کی۔ ڈارون نے اس نظریہ ارتقاء کو مندرجہ ذیل چار اصولوں پر استوار کیا ہے۔

۱۔ تنازع للبقاء (Struggal for existence)

اس سے مراد زندگی کی بقا کے لیے کشمکش ہے، جس میں صرف وہ جاندار باقی رہ جاتے ہیں جو زیادہ مکمل اور طاقتور ہوں اور کمزور جاندار ختم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کسی جنگل میں وحشی بیل ایک ساتھ چرتے ہیں۔ پھر جو اُن میں طاقتور ہوتا ہے وُہ گھاس پر قبضہ جما لیتا ہے اور اس طرح مزید طاقتور ہو جاتا ہے مگر کمزور، خوراک کی نایابی کے باعث کمزور تر ہو کر بالآخر ختم ہو جاتا ہے اسی کشمکش کا نام تنازع للبقاء ہے۔

۲۔ اس کا دوسرا اصول طبعی انتخاب (Natural selection) ہے۔ اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ مثلاً اُوپر کی مثال میں وحشی بیل دُور کی مسافت طے کرتے اور دشوار گزار راستوں سے گزرتے ہیں تو جو طاقتور ہوتے ہیں وُہی یہ مسافت طے کر پاتے ہیں اور اپنے آپ کو خطرات سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ گویا فطرت خود طاقتور اور مضبوط کو باقی رکھتی اور کمزور و ناقص کو ختم کر دیتی ہے۔

اگرچہ مندرجہ بالا دو الگ الگ اصول بتلائے گئے ہیں مگر دونوں کا نتیجہ دراصل ایک ہی ہے جو بمصداق ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتوٰے ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

کمزور جنس کے ختم ہو جانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ ماحول سے ہم آہنگی (Adaptation)

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ شیر ایک درندہ گوشت خور جانور ہے۔ فطرت نے اسے شکار کے لیے پنجے اور گوشت کھانے کے لیے نوکیلے دانت عطا کیے ہیں۔ اب اگر اسے مدت دراز تک گوشت نہ ملے تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو وہ بھوک سے ختم ہو جائے گا یا نباتات کھانے لگ جائے گا۔ اس دوسری صورت میں اس کے تیز دانت اور پنجے رفتہ رفتہ خود بخود ختم ہو جائیں گے اور ایسے نئے اعضا۔ وجود میں آنے لگیں گے جو موجودہ مشیت کے مطابق ہوں۔ اس کی آنتیں بھی طویل ہو کر سبزی خور جانوروں کے مشابہ ہو جائیں گی۔ اسی طرح اگر شیر کو خوراک ملنے کی واحد صورت یہ ہو کہ یہ اسے کسی درخت پر چڑھ کر حاصل کرنی پڑے تو ایسے اعضا۔ پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے جو درختوں پر چڑھنے میں مدد دے سکیں۔

۴۔ قانونِ وراثت: (Law of heritence) اس کا مطلب یہ ہے کہ،

اصول کی رُو سے یعنی مشیت اور ماحول کے اختلاف سے جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں وہ نسلاً بعد نسلٍ آگے منتقل ہوتی جاتی ہیں تا آنکہ یہ اختلاف فرعی نہیں بلکہ نوعی بن جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ دو الگ الگ نسلیں ہیں، جیسے گدھا اور گھوڑا ایک ہی نوع ہیں۔ مگر گدھا گھوڑے سے اس لیے مختلف ہوگیا کہ اس کی معاشی صورتِ حال بھی بدل گئی اور اصولِ معاش کے لیے اس کی جد وجہد میں بھی اضافہ ہوگیا۔

یہ ہے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا خلاصہ جو اس وقت بھی صرف نظریہ ہی تھا اور آج بھی نظریہ ہی ہے۔ اس نظریہ کو کوئی ایسی ٹھوس بنیاد مہیا نہیں ہوسکی جس کی وجہ سے یہ نظریہ سائنس کا قانون (Scientific law) بن سکے۔ اس نظریہ پر بعد کے مفکرین نے شدید اعتراضات کیے، مثلاً:

نظریۂ ارتقاء پر اعتراضات:

۱۔ زندگی کی ابتداء کیسے ہوگئی؟ معلول تو موجود ہے لیکن علت کی کڑی نہیں ملتی۔ گویا اس نظریہ کی بنیاد ہی سائنسی لحاظ سے کمزور ہے۔ اس سلسلہ میں پرویز صاحب اپنی کتاب "انسان نے کیا سوچا"، کے صفحہ ۵۵ پر رقمطراز ہیں:

"یہ تو ڈارون نے کہا تھا لیکن خود ہمارے زمانے کا ماہرِ ارتقاء (simpson) زندگی کی ابتداء اور سلسلۂ علت ومعلول کی اولین کڑی کے متعلق لکھتا ہے، زندگی کی ابتداء کیسے ہوگئی؟ نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں..... اس معمّہ کو حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کے قریب پہنچا جارہا ہے.... لیکن اس معمہ کا آخری نقطہ (یعنی زندگی کا نقطۂ آغاز) وہ ہے جو سائنس کے انکشافات کی دسترس سے باہر ہے اور شائد انسان کے حیطۂ ادراک سے ہی باہر.... کائنات کے آغاز اور سلسلۂ علت ومعلول کی اولین کڑی کا مسئلہ لاینحل ہے اور سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی.... یہ اولین کڑی راز ہے اور میرا خیال ہے کہ ذہنِ انسانی اس راز کو کبھی نہیں پا سکے گا۔ ہم اگر چاہیں تو اپنے اپنے طریق پر اس علتِ اولیٰ کے حضور اپنے سر جھکا سکتے ہیں لیکن اسے اپنے ادراک کے دائرے میں کبھی نہیں لا سکتے۔"

گویا نظریۂ ارتقاء کے مادہ پرست قائلین کو آج تک اس کے لیے کوئی سائنسی اور حسی دلیل

مہیا نہیں ہو سکی۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ارتقاء کا کوئی ایک واقعہ بھی آج تک کسی انسان نے مشاہدہ نہیں کیا یعنی کوئی چڑیا ارتقاء کر کے مرغا بن گئی ہو یا گدھا ارتقاء کر کے گھوڑا بن گیا ہو یا لوگوں نے کسی بندر کو انسان بنتے دیکھا ہو۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکا ہے کہ فلاں دور میں ارتقاء ہوا تھا۔ جس طرح جملہ حیوانات ابتدائے آفرینش سے تحقیق کیے گئے ہیں آج تک اسی طرح چلے آتے ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ البتہ بعض ایسی مثالیں ضرور ملتی ہیں جو نظریۂ ارتقاء کو رد کر دیتی ہیں مثلاً ریشم کا کیڑا جو عموماً موسم برسات میں شہتوت کے پتوں پر گزر اوقات کرتا ہے۔ جب ساٹھ دن کا ہو جاتا ہے تو اس کا رنگ سیاہ سے سفید ہو جاتا ہے۔ اس کے منہ سے ایک مادہ تاروں کی شکل میں نکلتا ہے جسے یہ اپنے جسم کے گرد لپیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ تار ساتھ ہی ساتھ خشک ہوتے جاتے ہیں۔ ریشم کے کیڑے کے گرد تاروں کا یہ جال جب اخروٹ کے برابر ہو جاتا ہے تو اس کے اندر کیڑا مر جاتا ہے اور اس کے سیاہ مادے سے ایک سفید تتلی بن جاتی ہے۔ جب یہ باہر نکلتی ہے تو نر و مادہ کا ملاپ ہوتا ہے پھر مادہ انڈے دیتی ہے اور دونوں نر و مادہ مر جاتے ہیں۔ اس کیڑے کا بالخصوص اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ انسان زمانہ قدیم سے ریشم حاصل کر رہا ہے اور اس کیڑے کی داستانِ حیات اس کے سامنے رہتی ہے۔ اس کیڑے کی داستانِ حیات میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی نہ ہی ارتقاء کا عمل کبھی پیش آیا۔ اسی طرح بعض کمتر درجے کے بحری جانور جو ابتدائے زمانہ میں پائے جاتے تھے، آج بھی اسی شکل میں موجود ہیں۔ ان پر ارتقاء کا کوئی عمل نہیں ہوا۔ حشرات الارض کا وجود بھی نظریۂ ارتقاء کی تردید کرتا ہے اس لیے بعض مفکرین ارتقاء کے منکر ہیں، اس کے بجائے تخلیقِ خصوصی (Special creation) کے قائل ہیں۔ یعنی ہر نوع زندگی کی تخلیق بالکل الگ طور پر ہوئی ہے۔ ایک مفکر (De vries) ارتقاء کے بجائے انتقال (Mutation) کا قائل ہے جسے آج کل فجائی ارتقاء (Emergent evolution) کا نام دیا جاتا ہے۔

۳۔ نظریۂ ارتقاء پر تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی درمیانی کڑیاں موجود نہیں۔ مثلاً جوڑوں والے اور بغیر جوڑوں والے جانوروں کی درمیانی کڑی موجود نہیں۔ فقری اور غیر فقری جانوروں کی درمیانی کڑی بھی مفقود ہے۔ مچھلیوں اور ان حیوانات کی درمیانی کڑی بھی غائب ہے جو خشکی اور پانی کے جانور کہلاتے ہیں۔ اسی طرح رینگنے والے جانوروں اور پرندوں، سینگنے والے

جانوروں اور ممالیہ جانوروں کی درمیانی کڑیاں بھی مفقود ہیں۔ فلسفۂ ارتقاء کی یہ اصل دشواری ہے۔ جو سالہا سے زیر بحث چلی آ رہی ہے۔

بعض نظریۂ ارتقاء کے قائلین اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ درمیانی کڑی کا جب کام پورا ہو چکتا ہے تو وہ از خود غائب ہو جاتی ہے۔ اس جواب میں جتنا وزن یا معقولیت ہے اس کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

۴۔ چوتھا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جب اس نظریہ کی رُو سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ پہلا انسان کمزور جسم اور ناقص العقل تھا تو اس نے شیروں اور چیتوں کے درمیان گزارہ کیسے کیا اور اس کمزوری اور بے عقلی کے باوجود تنازع للبقاء میں کامیاب کیسے ہو گیا؟

۵۔ پانچواں اعتراض بڑا وزنی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابتدائے زندگی سے بندر تک جو شعوری ترقی دو ارب سال میں واقع ہوئی ہے، بندر اور انسان کا درمیانی شعوری فرق اس سے بہت زیادہ ہے جس کے لیے ارب ہا سال کی مدت درکار ہے۔ جبکہ زمین کی عمر صرف ۲ ارب سال بتائی جاتی ہے۔ یہ ذہنی ترقی انسان میں یکدم کیونکر آ گئی؟

۶۔ ڈارون نے نظریۂ ارتقاء کے جو اصول بتلاتے ہیں وہ مشاہدات کی رُو سے صحیح ثابت نہیں ہوتے، مثلاً:

ا۔ ایک اصول قانونِ وراثت ہے۔ ڈارون کہتا ہے کہ لوگ کچھ عرصہ تک کتوں کی دُم کاٹتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتے بے دُم پیدا ہونے لگے۔ جس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ عرب اور عبرانی لوگ صدیوں سے ختنہ کرواتے چلے آئے ہیں لیکن آج تک کوئی مختون بچہ پیدا نہیں ہوا۔

ب: ماحول سے ہم آہنگی پر یہ اعتراض ہے کہ انسان کے پستانوں کا بدنما داغ آج تک کیوں باقی ہے جس کی کسی دور میں بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور انسان سے کمتر درجے کے جانوروں (نروں) میں یہ داغ موجود نہیں تو انسان میں کیسے آ گیا؟ علاوہ ازیں یہ کہ ایک ہی جغرافیائی ماحول میں رہنے والے جانوروں کے درمیان فرق کیوں ہوتا ہے؟

۷۔ رکاز کی دریافت بھی نظریۂ ارتقاء کو بالکل باطل قرار دیتی ہے۔ رکاز (Palaeontology) سے مراد انسانی کھوپڑیاں یا جانوروں کے وہ پنجر اور ہڈیاں ہیں جو زمین میں مدفون پائی جاتی ہیں۔ نظریۂ ارتقاء کی رُو سے کمتر درجے کے جانوروں کی ہڈیاں زمین کے زیریں حصہ میں پائی جانی چاہئیں

جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایسی ہڈیاں عموماً زمین کے بالائی حصہ میں ملی ہیں۔ ارتقائی یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان لاکھوں سال قبل جسمانی اور عقلی لحاظ سے ناقص تھا۔ بالآخر تکمیل کی طرف آیا۔ رکاز کی دریافت اس بات کی بھی تردید کرتی ہے کیونکہ بالائی طبقوں میں جو رکاز ملے ہیں وہ غیر مکمل اور ناقص انسان کی یادگار ہیں اور زیریں طبقوں میں اعلیٰ انسان کے رکاز ملے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا۔

نظریۂ ارتقاء اور مغربی مفکرین:

یہ ہیں وہ اعتراضات جنھوں نے اس نظریہ کے انجر پنجر تک ہلا دیے ہیں۔ گزشتہ ڈیڑھ صدی نے اس نظریہ میں استحکام کی بجائے اس کی جڑیں بھی ہلا دی ہیں۔ اب اس نظریہ کے متعلق چند مغربی مفکرین کے اقوال بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

۱۔ ایک اطالوی سائنسدان روزا کہتا ہے کہ گذشتہ ساٹھ سال کے تجربات نظریۂ ڈاروِن کو باطل قرار دے چکے ہیں۔ (اسلام اور نظریۂ ارتقاء)

۲۔ ڈی وریز (De vries) ارتقاء کو باطل قرار دیتا ہے، وہ اس نظریہ کے بجائے (Mutation) یا انتقالِ نوع کا قائل ہے۔ (ایضاً)

۳۔ ولاس (Wallace) عام ارتقاء کا قائل ہے لیکن وہ انسان کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ (ایضاً ص ۶۱)

۴۔ فرخو کہتا ہے کہ انسان اور بندر میں بہت فرق ہے اور یہ کہنا بالکل لغو ہے کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔

۵۔ میفرٹ کہتا ہے کہ ڈاروِن کے مذہب کی تائید ناممکن ہے اور اس کی رائے بچوں کی باتوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

۶۔ آغاسیز کہتا ہے کہ ڈاروِن کا مذہب سائنسی لحاظ سے بالکل غلط اور بے اصل ہے اور اس قسم کی باتوں کا علم سائنس سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ (ایضاص ۶۲)

۷۔ ہکسلے (Huxley) کہتا ہے کہ جو دلائل ارتقاء کے لیے دیے جاتے ہیں ان سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی کہ نباتات یا حیوانات کی کوئی نوع کبھی طبعی انتخاب سے پیدا ہوئی ہو۔ (ایضاً ص ۱۱۸)

۸۔ ٹنڈل کہتا ہے کہ نظریۂ ڈاروِن قطعاً ناقابلِ التفات ہے کیونکہ جن مقدمات پر اس نظریہ

کی بنیاد ہے وہ قابلِ تسلیم ہی نہیں ہیں۔

نظریۂ ارتقاء کی مقبولیت :

اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ نظریۂ ارتقاء اتنا ہی غیر سائنٹیفک ہے تو یہ قبول کیسے ہو گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا پرچار کرنے والوں میں مادہ پرست، دہریت پسند اور اشتراکیت نواز سب شامل ہو جاتے ہیں۔ دہریت، مادہ پرستی، لاادریت اور اشتراکیت بذاتِ خود الگ الگ مذہب ہیں۔ یہ نظریہ چونکہ الحاد اور خدا سے انکار کی طرف لے جاتا ہے لہذا انھیں ایک دلیل کا کام دیتا ہے۔

ڈارون خود پہلے خدا پرست تھا۔ جب اس نے کتاب اصل الانواع لکھی تو اس وقت وہ لاادریت کی طرف مائل ہو گیا۔ پھر جب اس نے اور بھی دو کتابیں لکھیں اور اپنے نظریہ میں پختہ ہو گیا تو خدا کا منکر بن گیا اور اہلِ کلیسا نے اس پر کفر و الحاد کا فتوےٰ لگا دیا۔

نظریۂ ارتقاء اور منکرینِ قرآن :

سوچنے کی بات ہے کہ وہ نظریہ جسے مغربی منکرین ناقابلِ اعتماد ٹھہرا چکے ہیں تو ہمارے قرآنی منکرین کو احادیث جیسے "ظنی علم" کو رد کر کے اس "یقینی علم" کو سینے سے لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ سائنسی نظریات کا تو یہ حال ہے کہ جب وہ اپنے تجرباتی اور تحقیقی مراحل سے گزرنے کے بعد سائنسی قانون (Law) بن جاتے ہیں۔ تب بھی انہیں آخری حقیقت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بعد میں آنے والے منکر ایسے سائنسی قوانین کو رد کر دیتے ہیں۔ نیوٹن کے دریافت کردہ قانون کششِ ثقل کو آئن سٹائن نے مشکوک قرار دیا۔ یہی صورتِ حال اس کے قوانینِ حرکت کی ہے تو ایسی صورتِ حال میں ان نظریات کو تاویل و تحریف کے ذریعہ قرآن سے ثابت کرنا کوئی دینی خدمت یا قرآنی فکر قرار دیا جا سکتا ہے؟

پرویز صاحب نے اس نظریۂ ارتقاء کو دو شرائط کے ساتھ اپنایا ہے :

۱۔ یہ کہ پہلے جرثومۂ حیات میں زندگی کسی نہ کسی طرح خود بخود ہی پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ زندگی خدا نے عطا کی تھی۔

۲۔ انسان کا فکر و شعور ارتقاء کا نتیجہ نہیں بلکہ نفخِ خداوندی کا نتیجہ ہے اور یہ کہ نفخِ رُوحِ خداوندی فجائی ارتقاء کے طور پر واقعہ ہوا۔ فجائی ارتقاء کے نظریہ کا موجد موجودہ دور کا امام لائڈ مارگن ہے جس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فجائی ارتقاء ممکن العمل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر خدا ہی کو خالقِ زندگی اور نفخِ رُوح کا بطور فجائی ارتقاء عامل تسلیم کرنا ہے تو پھر کیوں نہ آدم کو عام قانونِ ارتقاء سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے۔ استثناء کا قانون بھی تو آخر اس کائنات میں موجود ہے۔ گو اس قانون تک انسان کی دسترس آج تک نہیں ہو سکی، پھر یہ سوال بھی بڑا وزنی ہے کہ جب نوعِ انسان پہلے سے چلی آ رہی تھی تو کیا نفخِ رُوح اس نوع کے سارے افراد میں ہوا تھا یا کسی فردِ واحد میں؟ اگر کسی فردِ واحد میں ہوا تو وہ کون تھا اور یہ واقعہ کس دور میں ہوا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ان حضرات کے پاس کوئی جواب نہیں۔

منکرینِ قرآن کے قرآنی دلائل:

حقیقت میں دیکھا جائے تو قرآن میں کوئی ایسی نص موجود نہیں جو انسان کو نظریۂ ارتقاء کی کڑی میں منسلک کر دے، تاہم جن آیات سے استشہاد کیا جاتا ہے وہ درج ذیل ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً۔ (النساء)

"اے لوگو! خدا سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے کثیر مرد اور عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیے۔"

یہ آیت اپنے مطلب میں صاف ہے کہ نفسِ واحدہ سے مراد آدم علیہ السلام ہیں لیکن ہمارے یہ دوست نفسِ واحدہ سے مراد پہلا جرثومۂ حیات لیتے ہیں۔ اس جرثومۂ حیات کے متعلق نظریہ ہے کہ وہ کٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا پھر ان میں سے ہر ایک بڑا ہو کر پھر کٹ کر دو دو ٹکڑے ہوتا گیا۔ اس طرح زندگی میں وسعت پیدا ہوتی گئی جو جمادات سے نباتات، نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے انسان تک پہنچی ہے۔

یہ تصور اس لحاظ سے غلط ہے کہ "خلق منها زوجها" کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ اس جوڑے سے آئندہ نسل توالد و تناسل کے ذریعہ چلی تھی جبکہ جرثومۂ حیات کی

صورت یہ نہیں ہوتی ۔ آج بھی جراثیم کی افزائش اسی طرح ہوتی ہے کہ ایک جراثیم کٹ کر دو حصے بن جاتا ہے ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کٹ کر دو حصے بن جاتا ہے ۔ اس طرح افزائش ہوتی چلی جاتی ہے ، ان میں توالد و تناسل نہیں ہوتا ۔ لہٰذا وہ ایک جرثومہ کے دو ٹکڑے تو کہلا سکتے ہیں زوج نہیں کہلا سکتے ۔

۲۔ دوسری آیت یہ ہے :

" اقرأ باسم ربك الذى خلق ۔ خلق الانسان من علق ۔ "

(العلق ۱،۲)

"(اے محمدؐ !) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھیے جس نے (کائنات کو) پیدا کیا ۔
جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا ۔"

اس آیت میں " علق " کا لغوی معنیٰ جما ہوا خون بھی ہے اور جونک بھی ۔ ہمارے یہ دوست اس سے دوسرا معنیٰ مراد لیتے ہیں اور اسے رحمِ مادر کی کیفیت قرار نہیں دیتے ۔ بلکہ اس سے ارتقائی زندگی کے سفر کا وہ دور مراد لیتے ہیں جب جونک کی قسم کے جانور وجود میں آئے اور کہتے ہیں کہ انسان انہی جانداروں کی ارتقائی شکل ہے ۔

اس اشکال کو ، کہ آیا یہ رحمِ مادر کا قصہ ہے یا ارتقائے زندگی کے سفر کی داستان ، درج ذیل آیت دور کر دیتی ہے :

" ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاما فكسونا العظام لحما ثم انشأناه خلقا آخر فتبارك الله احسن الخالقين ۔ " (المؤمنون ۱۴)

" پھر نطفہ کا لوتھڑا (علق) بنایا ۔ پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی ۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا ۔ پھر اس (انسان کو) نئی صورت میں بنا دیا تو خدا سب سے بہتر بنانے والا بڑا بابرکت ہے ۔"

انسان کی پیدائش کے یہ تدریجی مراحل صاف بتا رہے ہیں کہ یہ رحمِ مادر میں ہونے والے تغیرات ہیں ، کیونکہ ارتقائے زندگی کے مراحل ان پر منطبق نہیں ہوتے ۔ نیز یہ بھی کہ قرآن مجید نے " علق " یا " علقہ " سے مراد رحمِ مادر میں جما ہوا خون ہی لیا ہے ۔ اس سے ارتقائی نظریہ کی جونک مراد نہیں ۔

۳- تیسری آیت یہ ہے :

"ولقد خلقکم اطوارا"

(۱) "حالانکہ اسی نے تم سب کو مختلف حالات میں پیدا کیا ہے"۔ (تفسیر ثنائی)

(۲) "حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح (کی حالتوں) میں پیدا کیا ہے"۔ (فتح محمد جالندھری)

(۳) "حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا ہے"۔ (تفہیم القرآن ـــــ اور اس سے مولانا مودودی نے وہی تخلیقی مراحل مراد لیے ہیں جو رحم مادر میں ہوتے ہیں۔

پرویز صاحب اس آیت سے ارتقائے زندگی کے مراحل مراد لیتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسی وجہ نہیں کہ اس سے رحمِ مادر کے مراحل مراد نہ لیے جائیں جبکہ سورۃ علق کی مندرجہ بالا آیت اس کی وضاحت بھی کر رہی ہے اور کوئی ایسا قرینہ بھی موجود نہیں جس سے پرویز صاحب کے نظریہ کی تائید ہو سکے۔

۴- "وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا"

(۱) "اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے"۔ (فتح محمد)

(۲) "اللہ نے تم کو زمین سے پیدا کیا"۔ (تفسیر ثنائی)

(۳) "اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا"۔ (تفہیم القرآن)

پرویز صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ "اور ہم نے تمہیں زمین سے اگایا ایک طرح کا اگانا"۔ اور اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ انسان نباتات او[illegible]ت کے رستے سے ہوتا ہوا وجود میں آیا ہے

آیت مندرجہ بالا میں "[illegible]بت" کا لفظ لغوی اعتبار سے ہر بڑھنے والی چیز پر بولا جاتا ہے نباتات، حیوانات اور انسان سب پر اس کا یکساں استعمال ہوتا ہے۔ (امام راغب) اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی چیز خوب پھل پھول رہی ہو تو یہ لفظ استعمال ہوتا ہے مثلاً "نبت الغلام" بمعنی "لڑکے کا جوان ہونا، بچہ کی پرورش کرنا" (لازم و متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ (المنجد) "نبت ثدی الجاریۃ" "لڑکی کے پستان ابھر آنا"۔ (منتہی الادب) اسی طرح جب ایک بچہ کی اس طرح پرورش ہو رہی ہو کہ وہ اپنی اصل عمر سے بڑا اور خوب پلا پوسا معلوم ہوتا ہو تو "انبت" کا لفظ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے :

"فتقبلہا ربہا بقبول حسن وانبتہا نباتا حسنا" (آل عمران ۳۷)

"تو خدا نے مریم کو پسندیدگی کے قابل قبول فرمایا اور اسے اچھی طرح پرورش کیا"۔

اندریں صورتِ حال یہ آیت بھی نظریۂ ارتقاء کی کوئی موثر دلیل نہیں ہوسکتی۔

۵۔ قصۂ آدم کے سلسلہ میں پرویز صاحب نے درج ذیل آیت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ:

"ولقد خلقناکم ثم صورنٰکم ثم قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لاٰدم"

(الاعراف ۱۱)

"اور ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری شکل وصورت بنائی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو"

اس سے آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آیتِ مذکورہ میں جمع کا صیغہ اس بات کی دلیل ہے کہ آدمؑ سے پہلے بنی نوعِ انسان موجود تھی۔ کیونکہ ملائکہ کے سجدہ کا ذکر بعد میں ہوا ہے پھر سورۃ اعراف کی آیات ۱۱- ۲۵ تک توجہ دلائی ہے جہاں کہیں آدم اور اس کی بیوی کے لیے تثنیہ کا صیغہ آیا ہے، لیکن اکثر مقامات پر جمع کا صیغہ ہے۔

اس کے جواب میں اتنا ہی عرض کریں گے کہ آپ اگر آیات (۱۱- ۲۵) کے بجائے (۲-۲۵) پر غور کرنے کو فرما دیتے تو تثنیہ کے صیغہ کی حقیقت معلوم ہوجاتی۔

ابتداء میں حضور اکرمؐ کے دور کے تمام موجود انسانوں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ "اپنے پروردگار سے نازل شدہ وحی کی تابعداری کرو" پھر آگے چل کر آدمؑ، آپ کی بیوی اور ابلیس وغیرہ کا قصہ مذکور ہے تو قرآن میں حسبِ محل صیغوں کا استعمال ہوا ہے۔ ان آیات کے مخاطب آدمؑ اور اُن کی اولاد ہے نہ کہ آدم اور ان کے آباؤ اجداد یا بھائی بند، جو آپ کے خیال میں اس جنت میں رہتے تھے جس کے متعلق خُدا نے فرمایا:

"یاٰدم اسکن انت وزوجک الجنۃ"

"اے آدمؑ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو"

اگر جنت میں اس "آدم" کی سابقہ نسل بھی رہتی تھی تو محض آدم اور اس کی بیوی کو جنت میں رہنے کی ہدایت بالکل بے معنی ہوجاتی ہے۔

اس آیت کا دوسرا پہلو جس کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ نے صرف حضرت آدمؑ کو بطورِ خصوصی تخلیق پیدا کیا تھا تو آیتِ بالا میں "کم" کی ضمیر جمع کیوں استعمال ہوئی ہے؟ تو ہم عرض کریں گے کہ محاورۂ عرب میں موقع ومحل کے لحاظ سے واحد کے لیے جمع

کے استعمال کی اور بھی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

" والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولٰئک ھم المتقون۔"

" اور جو شخص سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی وُہی لوگ متقی ہیں۔"

تخلیقِ آدم سے متعلق درج ذیل آیت اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہے۔ ارشادِ باری ہے:

" ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئا مذکورا۔"

(الدھر)

" بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وُہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔"

اب دیکھیے " دہر" سے مراد وُہ زمانہ ہے جس کا آغاز ابتدائے آفرینش سے ہُوا ہے اور عصر سے مراد وُہ زمانہ ہے جس کا آغاز تخلیقِ آدم سے ہُوا ہے کیونکہ انسانی افعال و اعمال پر اللہ نے عصر کو بطورِ شہادت پیش کیا ہے دہر کو نہیں۔ ارشادِ باری ہے کہ اس " دہر" میں انسان پر ایسا وقت بھی آیا ہے جبکہ وُہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ اگر وُہ نباتات حیوانات یا بندر کی اولاد ہوتا تو یہ چیزیں تو سب قابلِ ذکر ہیں۔ آخر ان کا نام لینے میں کیا حرج تھا؛ ہمارے خیال میں یہی آیت ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو کلی طور پر مردود قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

تخلیقِ آدم اور قرآن :

اب دیکھیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے جو مختلف مراحل بیان فرمائے ہیں، وُہ یہ ہیں،

۱۔ تراب بمعنی خشک مٹی (المؤمن : ۶۷) ۲۔ ارض بمعنی عام مٹی یا زمین (نوح : ۱۷) ۳۔ طین بمعنی گیلی مٹی گارا (الانعام: ۲) ۴۔ طین لازب بمعنی لیسدار اور چیپک دار مٹی (الصّٰفّٰت ۱۱) ۵۔ حمأ مسنون بمعنی بدبو دار کیچڑ (الحجر ۲۶) ۶۔ صلصال بمعنی ٹھیکرا۔ حرارت سے پکائی ہوئی مٹی (ایضاً) ۷۔ صلصال کالفخار بمعنی ٹن سے بجنے والی ٹھیکری۔ (الرحمٰن: ۱۴)

یہ ساتوں مراحل بس جمادات میں پورے ہو جاتے ہیں۔ مٹی میں پانی کی آمیزش ضرور ہوئی لیکن پھر وُہ بھی پوری طرح خشک کر دیا گیا۔ غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسان کے جو سات مراحل بیان فرمائے ہیں وُہ سب کے سب ایک ہی نوع (جمادات) سے متعلق ہیں۔ ان میں کہیں نباتات اور حیوانات کا ذکر آیا ہے؟ اگر انسان کی تخلیق نباتات اور حیوانات کے راستے

سے ہوتی تو ان کا بھی کہیں تو ذکر ہونا چاہیے تھا۔

پھر قرآن میں یہ بھی مذکور ہے:

"قال یا ابلیس ما منعك ان تسجد لما خلقت بیدی" الزمر (۷۵)

"خدا نے فرمایا کہ اے ابلیس جس شخص کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا؟"

اب خدا کے ہاتھوں سے اس لیے انکار کر دیا جائے کہ خدا کے متعلق تجریدی تصور ہی راہِ صواب ہے۔ یا "ید" سے مراد قوت و قدرت ہے اور حدیث اگر آیت کی تائید کرے تو اسے ظنی کہہ دیا جائے اور اگر تورات بھی تائید کرے تو اس کی ہر ایسی آیت کو محرف قرار دیا جائے جو آپ کے قرآنی فکر سے متصادم ہو۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد نظریۂ ارتقاء جیسے ناقابلِ اعتماد نظریہ کو صحیح قرآنی فکر قرار دیا جائے تو دلائل کی بات رہ کہاں جاتی ہے؟

قصۂ آدم و ابلیس

جنت، شجرِ ممنوعہ اور ہبوطِ آدم:

اب پرویز صاحب کی زبانی سنیے کہ آدم و ابلیس کی تمثیلی داستان کیا ہے؟ اور جنت، ابلیس، آدم، ملائکہ وغیرہ سے کیا مفہوم ہے؟ فرماتے ہیں:

"جنت کی زندگی سے مراد نوعِ انسانی کی زندگی کا وہ ابتدائی دور ہے جس میں رزق کی فراوانیاں تھیں[1]... انسان ملکیت کے لفظ سے ناآشنا تھا، جس کا جہاں جی چاہے سامانِ زیست لے لیتا۔ جس کا پہلا دور قبائلی زندگی کا تھا۔ یعنی اب نوعِ انسانی مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر الگ الگ ہو گئی۔

عربی زبان میں الگ الگ ہونے کو مشاجرت کہتے ہیں۔ اسی کا نام وہ شجر ہے جس کے قریب جانے سے انسان کو روکا گیا تھا" (ابلیس و آدم ص ۵۱، ۵۲)

---

[1] سرسید جنت سے مراد انسان کا عہدِ طفلی و شجرِ ممنوعہ سے مراد عقل و شعور اور ہبوطِ آدم سے مراد عقل و شعور کے بعد کی زندگی لیتے ہیں۔ پرویز صاحب اس مسئلہ میں سید صاحب سے پورا پورا اختلاف رکھتے ہیں اور بالکل نئی تاویلات پیش فرماتے ہیں۔

اب دیکھیے کہ (۱) اگر جنت سے مراد رزق کی فراوانیاں ہی ہے تو اس سے تو انسان کے سب آباؤ اجداد اور دیگر حیوانات فائدہ اٹھا رہے تھے۔ آدم وحوا کو جنت میں آباد کر کے خدا نے اس جوڑے پر کون سا احسان فرمایا تھا؟

۲۔ مشاجرت کے معنی تو واقعی الگ الگ ہونے کے ہیں۔ لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ آیا مشاجرت اور شجر کے ایک ہی معنی ہیں؟ شجر اسم جنس ہے اور شجرۃ کسی ایک درخت کو کہتے ہیں؛ الگ الگ بٹنے کو نہیں کہتے۔ جب کبھی یہ لفظ بطور اسم استعمال ہوا اس کے معنی درخت ہی ہوں گے۔

۳۔ جس کسی آدمی کو اللہ نے اس شجر یا مشاجرت سے منع کیا تھا (یعنی الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ جانا) وہ تو پہلے ہی واقع ہو چکی تھی۔ ایک چیز کے ہو جانے کے بعد یہ کہنا کہ "ایسا نہ کرنا"، کیا معنی رکھتا ہے؟

ابلیس اور ملائکہ:

"انفرادی عقل کا یہ تقاضا کہ دنیا میں سب کچھ میرے ہی لیے ہونا چاہیے، ابلیس کہلاتا ہے۔"

"ملائکہ یعنی کائنات کی قوتیں (جن سے رزق پیدا ہوتا ہے) انسان کے تابع فرمان ہیں.... وہ سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔" (ص ۵۲ ایضاً)

"وہ جذبہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ابلیس نے آدم کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ وہ اسے حیات جاوید عطا کرے گا اور اس کا ذریعہ بتلایا اولاد۔ یہ ہے مفہوم اس تمثیلی بیان کا جس میں کہا گیا ہے کہ اس حیات جاوید کے حصول کی تمنا میں انسان کے جنسی ترغیبات ابھر کر سامنے آ گئے۔"

(ابلیس وآدم ص ۵۳)

۱۔ اب دیکھیے، ابلیس کی کئی تعبیریں یہ لوگ کرتے ہیں۔ کہیں اس سے مراد عقل بیباک ہوتی ہے جو وحی کے تابع نہ ہو۔ کہیں ابلیس سے سرکشی اور بغاوت مفہوم لیا جاتا ہے۔ کہیں اسے ذاتی مفاد سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ یہ لفظ بس موم کی ناک ہے جدھر چاہیں موڑ لیں۔ البتہ ان سب معانی میں ایک بات بطور قدرِ مشترک ضرور پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابلیس کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابلیس نے تو خدا کے سامنے جھگڑا ہی یہ کھڑا کیا تھا کہ

میں آدم سے افضل ہوں۔ اگر انسان کے علاوہ ابلیس کا تصور ممکن نہیں تو یہ جھگڑا آخر کس نے کیا اور کس سے کیا۔؟

۲۔ یہی حال لفظ "ملائکہ" کا ہے، لیکن اس سے مراد انسان کے اندر نیکی کی قوتیں سمجھا جاتا ہے۔ کبھی اسے ملکۂ فطری سے تعبیر کیا جاتا ہے کبھی کائنات کی خارجی قوتوں سے۔ اس مقام پر ان قوتوں کو رزق سے محدود کر دیا گیا ہے۔ ان سب تعبیروں میں قدرِ مشترک یہی ہے کہ ملائکہ اپنا کوئی خارجی وجود یا تشخص نہیں رکھتے جبکہ قرآنِ مجید سے یہ ثابت ہے کہ ان کا خارجی وجود ہے اور ان پر ایمان لانا ایمان بالغیب کا ایک حصّہ ہے۔

۳۔ ابلیس کے قریب سے آدم اور اس کی بیوی نے درخت کا پھل چکھ لیا تھا۔ پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ وُہ پھل جنسی ترغیبات تھیں جس کے ذریعے اولاد پیدا ہوتی ہے اور انسان بزعمِ خود حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ (اس نظریہ کے مطابق) جنسی ترغیبات تو انسان سے بہت پہلے بندر میں بھی اور اس سے پہلے دیگر حیوانات میں بھی موجود تھیں اور اس سے بہت عرصہ بعد انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالتیں طے کرتا ہوا انسان بنا ہے۔ توالد و تناسل اور اولاد کا سلسلہ بھی بندروں میں موجود تھا۔ پھر اس مقام پر ابلیس نے آدم کو جنسی ترغیبات کی یہ کیا پٹی پڑھائی تھی؟

نظریۂ ارتقاء اور اسلامی تعلیمات کا تقابل

۱۔ قرآن انسان سے متعلق اشرف المخلوقات کا تصور پیش کرتا ہے جبکہ نظریۂ ارتقاء اسے بندر کی اولاد قرار دے کر اسے پست مقام پر لے آتا ہے۔ بندر انسان کے بمقابلہ حقیر تر اور ذلیل تر مخلوق ہے جس کا اعتراف سرسید احمد نے بھی "کونوا قردۃ خاسئین" کی تفسیر کے تحت کیا ہے۔

مغربی مفکرین کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ انہوں نے جب بھی انسان سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں تو اسے حیوانی سطح سے اُوپر نہیں اٹھنے دیتے۔ ارسطو نے انسان کو حیوانِ ناطق کہا، ڈارون نے اسے بندر کی اولاد قرار دیا۔ سگمنڈ فرائڈ نے اسے جنسی حیوان کہا اور مارکس و لینن نے انسان کو معاشی حیوان سے تعبیر کیا جبکہ قرآن انسان کو تمام مخلوقات سے بلند تر مقام پر فائز

کرتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"ولقد کرمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البر والبحر ورزقنٰھم من الطیبٰت وفضلنٰھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا"

(بنی اسرائیل ۔ ۷۰)

"اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی"

۲۔ نظریۂ ارتقاء وحدتِ حیات کا تصور پیش کرتا ہے جبکہ قرآن مجید "کان الناس امۃ واحدۃ" کہہ کر وحدتِ امت کا تصور پیش کرتا ہے۔ وحدتِ امت سے مراد یہ ہے، کہ جو حقوق اللہ نے انسان کو دیے ہیں دوسری کسی مخلوق کو نہیں دیے۔ مثلاً انسان حلال جانوروں کو ذبح کرکے کھا سکتا ہے اور ان سے اور بھی کئی طرح سے استفادہ کر سکتا ہے لیکن نظریۂ وحدتِ حیات انسان کو ایسے حقوق عطا نہیں کرتا۔ اسی بنا پر ہندوؤں کے ہاں اہنسا کا اصول کارفرما ہے اور وحدت الوجود کے قائلین جانوروں کو بھی بالکل اپنے ہم مرتبہ تصور کرتے ہیں۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کا انحصار ایمان بالغیب پر ہے۔ ایمان بالغیب کے اجزاء یہ ہیں:

خدا پر ایمان، فرشتوں کے خارجی وجود پر ایمان، نبیوں پر ایمان، الہامی کتابوں اور یوم آخرت پر ایمان، جبکہ نظریۂ ارتقاء ایمان بالغیب کے اکثر اجزاء کی جڑ کاٹ دیتا ہے جیسا کہ اس کتاب میں متفرق مقامات پر ذکر آیا ہے!

۴۔ نظریۂ ارتقاء الحاد کی راہوں پر ڈال دیتا ہے۔ اس کا سب سے پہلے اثر اس نظریہ کے بانی ڈارون پر ہوا۔ اشتراکی دہریت پسند اس نظریہ کا پرچار صرف اسی لیے کرتے ہیں کہ یہ نظریہ مذہب سے دور لے جاتا ہے۔ حالانکہ اشتراکی فلسفہ کی بنیاد نظریۂ اضداد یا جدلی نظریہ پر ہے جو نظریۂ ارتقاء کے مخالف ہے۔ تاہم یہ لوگ نظریۂ ارتقاء کا پرچار محض اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے مذہب سے تنفر اور اشتراکیت کے لیے راستہ ہموار ہو سکے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نظریۂ ارتقاء اسلام کے بنیادی عقائد سے براہِ راست متصادم ہے۔

نظریۂ ارتقاء کا مستقبل:

نظریۂ ارتقاء کا مطالعہ کرنے سے از خود یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ انسان جو ارتقائی منازل طے کرتا ہوا حیوانیت سے گزر کر درجۂ انسانیت تک پہنچا ہے، تو اب اس کی اگلی منزل

کیا ہوگی ؟ یہ نظریہ اگلی منزل کی کوئی نشاندہی نہیں کرتا۔ البتہ مغربی مفکرین یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ اب انسان کی اگلی منزل طبعی نہیں بلکہ ذہنی ہوگی۔ پرویز صاحب اس سوال کے جواب میں پروفیسر جوڈ کا اقتباس نقل کرتے ہیں :

"انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبعی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ہوگی۔ پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کرکے حیوانیت سے انسانیت کے درجہ پر آیا۔ پھر اس نے صنعت وحرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات واسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت وحرفت پر پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقاء نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کرکے انسان کے درجے میں قدم رکھے پھر اس کی جبلی ضرورتوں نے اوزار و آلات بنوائے اور وہ مشین اسٹیم کا خالق بنا۔ اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ترقی کی طرف ہوگا۔"

(قرآنی فیصلے ص ۳۴۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ انسان کے اس فجائی ارتقاء نے، جس سے اسے قوت اختیار وارادہ حاصل ہوا تھا۔ اس کے مادی ارتقاء کو ختم کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی آخری منزل بس انسان ہی ہے۔

۲۔ اگر طبیعی ارتقاء ہی نے حیوانی زندگی کو مجبور کیا تھا کہ وہ انسانی زندگی میں قدم رکھے تو حیوانی زندگی تو آج بھی موجود ہے لیکن کیا طبیعی ارتقاء نے کسی حیوان کو مجبور کیا ہے کہ وہ انسانی زندگی میں قدم رکھے ؟ اگر ایسا نہیں اور یقیناً ایسا نہیں تو یہ نظریہ از خود غلط قرار پاتا ہے۔

۳۔ ذہنی ترقی تو واضح ہے کہ کبھی پتھر کا زمانہ تھا، پھر دھات کا زمانہ آیا، پھر صنعت و حرفت کا۔ آج ایٹمی دور ہے لیکن اس میں نفسی ترقی کی کیا بات ہوئی ؟

صراطِ مستقیم کیا ہے ؟

پرویز صاحب کا نظریۂ ارتقاء سے متعلق ایک مضمون پڑھنے کے بعد کسی نے سوال کیا کہ :

"آپ نے لکھا کہ انسان سلسلۂ ارتقاء کی اوپر کی کڑی ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ

انسان میں مادی تغیرات سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں۔ یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے، اگر یہ ارتقاء مادی ہے تو انسان کا مزید ارتقاء بھی مادی ہونا چاہیے، کیا صراطِ مستقیم پر چلنے کے معنی یہی ہیں؟ یعنی جس خط پر اس وقت تک ارتقاء ہوتا چلا آیا ہے اسی پر آگے ارتقاء ہو"! (قرآنی فیصلے ص ۳۳۵)

اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد پرویز صاحب کے نزدیک وہ لائن ہے جس پر زندگی سفر کرتی ہوئی پہلے جرثومۂ حیات سے انسان تک پہنچی ہے اور اس صراطِ مستقیم کی اتنی منازل انسان طے کر چکا ہے، اب یہ صراطِ مستقیم آگے کہاں جاتا ہے اس کی تفصیل بھی پرویز صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

آپ نے صراطِ مستقیم سے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ قرآن کی یہ جامع اصطلاح بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، قرآن سے پہلے ذہن انسان کی دوری حرکت کا قائل تھا جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا۔ قرآن نے زندگی کا حرکیاتی (Dynamic) تصور پیش کر کے بتایا کہ حیات کسی چکر میں گردش نہیں کر رہی بلکہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے لہٰذا اس کی حرکت آگے بڑھنے والی ہے۔ صراطِ مستقیم سے اس غلط فلسفۂ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا ابطال ہو گیا اور اس صحیح مقصودِ حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہو گیا، پھر چونکہ مستقیم میں توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی مضمر ہے۔ اس لیے یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی کہ زندگی مختلف قوتوں میں توازن قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا کہ "صراطِ مستقیم" پر چلنے سے مراد یہ نہیں کہ زندگی اپنی موجودہ سطح پر چلتی رہے گی۔ زندگی کی راہ سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف جانے والی بھی۔ یعنی ایسا خط جو کسی نچلے طبقے سے اوپر کے نقطے کی طرف جاتا ہے۔ لترکبن طبقا عن طبق (۸۴/۱۹) تاکہ تم طبقاً طبقاً اوپر چڑھتے چلے جاؤ گے۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا کہ صراطِ مستقیم تمہارے اس نشو و نما دینے والے (رب) کی راہ (قانون) ہے جو ذی معارج (۷۰/۳) ہے یعنی سیڑھیوں والا خدا۔ سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اوپر لے جانے کا ذریعہ

بھی۔ گھسٹتے ہوئے اوپر جانے کا ذریعہ نہیں بلکہ اُبھرتے ہوئے (emerge) کرتے ہوئے) اوپر چڑھنے کا ذریعہ، یہ وُہ ذریعہ ہے جس سے انسان اقطار السموٰات والارض یعنی موجودہ زمان و مکان کی حدود سے آگے بھی نکل سکتا ہے۔"

(ایضاً ص ۲۴۲)

سو یہ ہے وُہ صراطِ مستقیم جس پر آئندہ انسانی زندگی کا ارتقاء ہوگا۔ گویا آپ کے خیال میں قرآن صرف نظریۂ ارتقاء کی یہ پیچیدگی حل کرنے کے لیے نازل ہُوا تھا کہ آئندہ زندگی کا سفر کس لائن پر ہوگا اور وُہ لائن کیسی ہوگی؟ غور فرمائیے کہ انسان کے اولین مخاطب جو ان پڑھ تھے انہوں نے اس فلسفیانہ پیچیدگیوں کو سمجھ لیا ہو گا؟ بہر حال آپ نے سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے کوئی آیت کہیں سے لی اور کوئی کہیں سے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ زندگی کی صراطِ مستقیم جو انسانی زندگی تک زمین ہی پر تھی اب وُہ اُوپر کی طرف چڑھے گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ زندگی کو اس صراطِ مستقیم کے ذریعہ اُوپر چڑھنے کا فائدہ کیا ہو گا۔ آپ کے نزدیک اُوپر کوئی خدا تو ہے نہیں، وُہ تو ہر جگہ موجود ہے، پھر اُوپر جا کر زندگی کرے گی کیا؟

ایک رُوحانی بزرگ صراطِ مستقیم کا تصور کچھ اس طرح پیش کرتے تھے کہ ذات باری سے ہر ایک جاندار ایک رُوحانی شعاع کے ذریعے منسلک ہے اور اس کی دلیل میں وُہ یہ آیت پیش کرتے تھے:

"ما من دابة الا هو اٰخذ بناصیتها" ہود ۵۶)

"(زمین پر) جو کوئی چلنے پھرنے والا ہے خدا اس کی چوٹی کو پکڑے ہُوئے ہے۔"

ان کے تصور کے مطابق اس روحانی شعاع کا ایک سرا ہر جاندار کے دماغ میں پیوست ہے اور دُوسرا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہی روحانی شعاع صراطِ مستقیم ہے اور اسی پر روحانی سفر ہو گا۔ اس زمین کے اُوپر ہوائی کرہ کے بعد سب سے پہلے جہنم آتا ہے پھر اعراف، پھر جنت، پھر عالمِ لاہوت، ملکوت، مثال اور عالمِ امر ہیں۔ پھر اس کے بعد عرشِ الٰہی ہے اور اس سے اُوپر ذاتِ باری تعالیٰ۔ اور بزعمِ خویش یہ بزرگ یہ روحانی سفر طے بھی کر چکے تھے۔ ان کی صراطِ مستقیم سے متعلق یہ تحقیق یا اُن کی دوسری تحقیقات ٹھیک ہوں یا غلط، اس سے ہمیں سروکار نہیں۔ البتہ ایک بات ان کی قابلِ فہم ہے اور وُہ یہ کہ وُہ خدا کو اُوپر سمجھتے تھے، لہٰذا ان کی صراطِ مستقیم کا رُخ اُوپر کی طرف ہی ہونا چاہیے تھا مگر پرویز صاحب کے نزدیک خدا اُوپر تو ہے نہیں

بلکہ ہر جگہ موجود ہے۔ پھر انہیں صراطِ مستقیم کو اُوپر کی طرف لے جانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اور یہ سوال بھی تاحال حل طلب ہے کہ اس صراطِ مستقیم کے ذریعہ ارتقاء کی اگلی منزل کیا ہوگی؟ اس سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں:

ارتقاء کی اگلی منزل:

"ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نہ تو انسان خالص طبیعی ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ (بلکہ اس کی انسانیت طبعی ارتقاء کے سلسلۂ علت و معلول سے الگ ہے) اور نہ ہی اس کا مزید ارتقاء طبیعی ہوگا۔ طبیعی ارتقاء کی پیداوار صرف اس کا جسم ہے، اس میں جوہرِ انسانیت غیر طبیعی ہے۔ جسمِ انسانی میں اس جوہرِ انسانیت کے فیصلوں کے لیے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ۔ اس کے بعد مزید ارتقاء جسمانی نہیں بلکہ جوہرِ انسانیت کا ہوگا جسے ہم موت کہتے ہیں، وُہ درحقیقت جوہرِ انسانیت کا جسم کے آسرے کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ جوہرِ انسانیت (انسانی اختیار و ارادہ) کی نشوونما ارتقاء قرآنی نظامِ ربوبیت سے ہوتی ہے، زندہ وُہ ہے جس کے اختیار و ارادے کی قوتیں (قرآن کی روشنی میں) تمام خارجی کائنات کو (جس میں خود اس کا جسم بھی شامل ہے) مسخر کیے جاتی ہیں نہ کہ وُہ جس کے جسم کی طبیعی مشینری چل رہی ہے۔ جو اس طرح زندہ ہے وُہ موت سے مر نہیں سکتا، اسی کا نام ارتقاء کی اگلی منزل طے کرنا ہے۔" (ایضاً ص ۳۴۸)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ ارتقاء کی اگلی منزل موت ہے۔ جب جسم کا آسرا ختم ہو جائے گا۔

۲۔ لیکن یہ ارتقاء کی منزل وُہی طے کر سکے گا جس کا جوہرِ انسانیت نشوونما یافتہ ہو ـــــ جو قرآنی نظامِ ربوبیت کے اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ موت تو سب کو آتی ہے اور جسم کا آسرا بھی سب کا ختم ہوتا ہے۔ جو لوگ نظامِ ربوبیت کے ذریعہ اپنے جوہرِ انسانیت کی نشوونما کر لیں گے۔ وُہ تو ارتقاء کی اگلی منزل طے کر جائیں گے اور جو اس نظام کو اختیار نہیں کرتے یا اس پر ایمان نہیں لاتے ان کا کیا بنے گا؟

آخرت کا تصوّر:

"جسم کا کام انسانی قوتِ فیصلہ (نفس) کے لیے معلومات فراہم کرنا اور اس کے

فیصلوں کو جاری کرنا ہوگا (یعنی قرآنی نظامِ ربوبیت یا قرآنی معاشرے میں) اس قوت میں جس قدر پختگی اور وسعت ہوتی جائے گی، اسی قدر انسانی زندگی ابدیت سے ہمکنار ہوتی جائے گی۔ جب جسمانی نظام طبیعی قانون کے تحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا، اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا۔" (ایضاً ص ۳۴۷)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت نظریۂ ارتقاء کا اصول بقاء لاصلح (survival of the fittest) لاگو ہوگا۔ پھر جس انسان نے اپنے نفس کو قرآنی نظامِ ربوبیت کے ذریعہ جس قدر پختہ کر لیا ہوگا، اسی قدر اس کا نفس ابدیت سے ہمکنار ہوگا۔ اسی نظریہ کا دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ جن لوگوں نے اس نظام کے ذریعہ اپنے نفس کو پختہ نہیں بنایا وہ ختم ہو جائیں گے اور تربیت یافتہ نفوس جو ابدیت سے ہمکنار ہونے والے ہیں۔ ان کو معلومات فراہم کرنے کے لیے (نیا جسم نہیں) بلکہ نیا نظام بھی مل جائے گا۔

اخروی زندگی:

اب کسی صاحب نے اس نئے نظام کے متعلق آپ سے مزید روشنی ڈالنے کی درخواست کی تو آپ نے اس کی وضاحت بدیں الفاظ فرمائی:

"زندگی کی موجودہ منزل میں انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ زندگی کی آئندہ منزل کے متعلق کچھ معلوم کر سکے۔ ہمارے ذرائع معلومات، ہمارے حواس و احساسات ہیں اور ان کا تعلق محسوسات و مدرکات سے ہے۔ لہٰذا جو چیزیں اس دائرہ سے باہر ہوں، ان کے متعلق ہم اپنے موجودہ ذرائع معلومات سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔ آنے والی زندگی کیسی ہوگی؟ اس کا نظام کیا ہوگا؟ اس کی شکل و صورت کیا ہوگی؟ ہم نہیں جان سکتے۔ اس پر البتہ ہمارا ایمان ہے کہ زندگی کا سلسلہ غیر منقطع ہے، اس لیے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی یقینی ہے اب تو سائنس کی تحقیقات کا رُخ بھی اس طرف ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا امکان یقینی ہے۔"

"علاوہ ازیں اس زندگی میں اس کاوش کی ضرورت بھی نہیں کہ آنے والی زندگی

کی کیفیت کیا ہوگی؟ آنے والی زندگی کا تعین قانونِ مکافاتِ عمل کے لیے ضروری ہے اور جس شخص کا ایمان ہے کہ زندگی مسلسل ہے۔اس کا یہ ایمان قانونِ مکافاتِ عمل کی غیر منقطع ہمہ گیری کے لیے کافی ہے۔یہی وُہ ایمان ہے جس پر اسلامی تصورِ حیات کی عمارت اٹھتی ہے۔" (ایضاً ص ۳۱۰)

سائل نے جو نئے نظام پر روشنی ڈالنے کے لیے کہا تو اس کا جواب آپنے دو صورتوں میں دیا ہے۔

۱۔ ہم موجودہ احساسات سے اس نظام کو سمجھ نہیں سکتے۔

۲۔ اس نظام کو سمجھنے کی ہمیں اس دُنیا میں کوئی ضرورت بھی نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن نے جو آخرت، یومِ جزا و سزا، جنت و دوزخ کی لاتعداد تفصیلات بیان کی ہیں اور حضور اکرمؐ نے اپنی مکی زندگی کا بیشتر حصّہ اس نئے نظام کو ہی ذہن نشین کرانے پر صرف کر دیا، کیا اس سے ہم صرف اس وجہ سے قطع نظر کر لیں کہ وُہ نیا نظام ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ وحی سے روشنی حاصل کرنے اور ایمان بالآخرت کا کیا مطلب ہے؟ اب نئے نظام کے ادراک کی ضرورت تو یہ ہے کہ اسی ادراک اور عقیدہ کی بنا پر ہماری یہ دنیوی زندگی بگڑتی یا سنورتی ہے۔اگر انہیں جاننے کی ضرورت ہی نہیں تو قرآن نے اتنی تفصیلات کیوں بیان کی ہیں۔

آپ زندگی کے غیر منقطع ہونے پر ایمان صرف اس لیے نہیں رکھتے ہیں کہ اس پر اسلامی تصورِ حیات کی عمارت اٹھتی ہے بلکہ اس کی دوسری وجوہ بھی آپ نے بیان فرما دی ہیں۔

۱۔ اب تو سائنس کی تحقیقات کا رُخ بھی اس طرف ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا امکان یقینی ہے۔

۲۔ مکافاتِ عمل کا وُہ بے لچک قانون جو کائنات میں جاری وساری ہے اور جسے مادہ پرست بھی تسلیم کرتے ہیں۔

ہمارے اس خیال کو بدظنی پر محمول نہ کیا جائے۔اگر وحی پر ایمان لانے کی بات درست ہو تو پھر نئے نظام کی تفصیل میں ہمارے موجودہ حواس پر انحصار کی ضرورت بھی کب پیش آتی ہے؟ ایمان بالغیب تو اسی چیز کا نام ہے کہ جو باتیں ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہیں۔انہیں ہم صرف اس لیے درست تسلیم کریں کہ وُہ بذریعہ وحی ہم تک پہنچی ہیں۔

طلوعِ اسلام کا تضاد؛

پرویز صاحب بہرحال اس بات کے قائل ہیں کہ زندگی غیر منقطع ہے اور موت کے بعد بھی جاری رہے گی، لیکن آپ کے استاد جناب حافظ محمد اسلم صاحب مرنے کے بعد اور قیامت تک کے درمیانی عرصہ یعنی برزخ میں کسی طرح کی زندگی کے قائل نہیں۔ قرآنی فیصلے میں ایک طویل مضمون، عذابِ قبر کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں حافظ صاحب موصوف نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ از روئے قرآن برزخ میں کوئی زندگی نہیں، جبکہ پرویز صاحب زندگی کے غیر منقطع ہونے کے قائل ہیں۔

(بقیہ الاستفتاء صفحہ ۹ سے آگے)

متقاضی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنے والے آدمی کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ چالیس روز یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کھڑا رہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ کسی نماز ادا کرنے والے کی نماز توڑنا بہرکیف ایک عظیم گناہ ہے جس سے پرہیز لازم ہے۔ ہاں اگر کسی آدمی کو بہت جلدی ہو اور وہ نمازی کی فراغت تک نہ ٹھہر سکتا ہو تو پھر حکم یہ ہے کہ وہ نماز ادا کرنے والے کے سامنے سے تین چار صفوں کا فاصلہ چھوڑ کر آگے سے گزر جائے۔ ان شاء اللہ ایسا کرنے میں گزرنے والے کو گناہ لازم نہیں ہوگا اور نہ نماز پڑھنے والے کی نماز میں کوئی خلل آئے گا۔ ان دونوں احادیث میں علماء حدیث نے یہی تطبیق دی ہے۔ یہ دونوں احادیث مشکوٰۃ المصابیح کتاب الصلوٰۃ میں موجود ہیں۔

پس فتوائے تو یہی ہے کہ اتنے فاصلہ سے گزر سکتا ہے، مگر تقوائے یہ ہے کہ نمازی کی فراغت تک وہیں کھڑا رہے۔ یہی اولیٰ اور احوط ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب!